معاہدۂ یہود علمی نقطۂ نظر سے

تصویر کا دوسرا رُخ

از مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی

(گذشتہ سے پیوستہ)

ان تمام دفعات سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں :-

(۱) اس معاہدہ کا مقصدِ عظیم مدینہ کی حفاظت، امن و اطمینان کے ساتھ مسلمانوں کی تنظیم اور حصولِ شوکت و طاقت کے لیے جدوجہد اور مشرکینِ مکہ کے مقابلہ میں متحدہ محاذ کا قیام تھا۔

(۲) مدینہ میں اس وقت قریش اور انصاری مسلمان، قبائل انصار کے منافقین، جو مسلمانوں ہی میں شمار کیے جاتے تھے۔ بنی قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع، بنی تمام، بنی عمرو۔ جیسے قحطانی یا اسرائیلی مشہور قبائلِ یہود (جو قلعوں اور فوجی سامانوں کے مالک تھے) اور قبائلِ انصار کے یہود آباد تھے۔ ان جماعتوں میں سے مسلمانوں پر بہرصورت آپ کا فیصلہ ناطق تھا۔ اس لیے اُن کے واسطے نہ معاہدہ کی ضرورت تھی اور نہ تحریری اعلانِ شاہی کی۔ قرآنِ عزیز اور احادیث (ارشاداتِ عالیہ) اُن کے لیے کافی تھے، مگر مقصد ۱ کے سلسلہ میں جب یہودِ مدینہ نے بھی اپنی مرضی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کا پابند کرنا گوارا کرلیا اور اس پیروی کو اپنے امن و اطمینان کے لیے مفید جانا تب اس تحریری معاہدہ کو کیا گیا۔

پس معاہدہ کے مقصد کے پیشِ نظر یہود میں سب سے پہلے وہی قابل خطاب تھے جن سے

ں مقصد کی خلل اندازی کا زیادہ خوف ہو سکتا تھا اور وہی مشہور قبائل زیر بحث تھے، اور نہ ان مشہور قبائل کے شریک معاہدہ ہوئے بغیر تنہا قبائل انصار کے یہود کا عہد مقصد کے لیے چنداں مفید نہ تھا۔ اسی لیے مولانا شبلیؒ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ اُن کا قیاس نہیں ہے بلکہ حقیقتِ حال کا اظہار ہے۔

(۳) "من تبعھم" سے مراد پابند معاہدہ" ہے۔ ذمی یا مستامن رعایا، یا اسیر و قیدی مراد نہیں ہیں۔ اس لیے کہ مدینہ میں اُس وقت تک مسلمانوں کو ایسی حاکمانہ حیثیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

(۴) جبکہ معاہدہ میں تمام یہود مخاطب تھے، تو پھر کسی خاص قبیلہ کی تصریح کی خواہ وہ کتنا ہی مشہور اور یہودیت میں پیشرو کیوں نہ ہو" قطعاً ضرورت نہ تھی اور "الیہود" لکھ دینا کافی تھا۔

(۵) اور انصاری قبائل کے یہودیوں کی تصریح کی وجہ وہ ہے جو ابھی سطور بالا میں پیش کی جا چکی، اسی لیے بعض قبائل کے متعلق ایہام دور کرنے کے لیے یہاں تک بھی لکھ دیا گیا کہ فلاں شاخ کے یہودیوں کا تعلق انصار کے فلاں قبیلہ سے ہے۔

وان بنی الشطیبۃ بطن من جفنۃ اور بلاشبہ بنی شطبہ، قبیلہ بنی جفنہ کی ہی شاخ ہے۔

لہٰذا یہ اعتراض "ایسی صورت میں تصریح کی ضرورت نہیں تھی بلکہ سیھود یثرب کلھا کہہ دینا کافی تھا" طرزِ تحریر پر ایک بے محل نکتہ چینی ہے۔ نیز قبائل انصار کے یہود اور مشہور قبائل یہود آپس میں متبوع اور تابع، سردار و حاکم اور رعایا و ماتحت کی طرح نہیں تھے نہ میری یہ مراد ہے جیسا کہ پروفیسر صاحب نے سمجھا ہے بلکہ وہ اس حالت میں تھے جس کا ذکر نمبر (۳) میں کیا جا چکا۔

لہٰذا جن معاہدوں میں آپ حاکموں اور شاہوں کا نام پاتے اور اس کے برعکس رعایا کے نام نہیں پاتے وہ ایسے معاہدے ہیں جو کسی مقام کے سلطان، یا حاکم سے کیے گئے ہیں ان کا معاملہ اہل مدینہ کا سا نہیں ہے۔

(۶) چونکہ بنی نضیر و بنی قریظہ و بنی قینقاع اس معاہدہ میں مخاطب اور بلا شبہ داخل تھے اس لیے وہ "ناقضین عہد" (عہد توڑنے والے) کہلائے، مشرکین مکہ کی طرح "حریف" نہیں کہلائے

اس کے بعد پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

"کیونکہ یہ نامہ نامی خود اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ وہ حضور کے یثرب میں تشریف لاتے ہی نہیں لکھا گیا جیسے کہ ہم بیان کر چکے ہیں اور خود اس کی شہادت سے"

مگر یہ معاہدہ تو خود اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ مدینہ کے تشریف لانے کے قریب ہی زمانہ میں لکھا گیا ہے اور جس غرض سے لکھا گیا ہے اُس کا تقاضہ بھی یہی تھا۔ اور یہی اُمتِ مسلمہ کے تمام علماء نے سمجھا ہے اور آپ نے جو کچھ اب تک بیان فرمایا ہے اُس سے بھی اس کی تردید نہیں ہو سکی تو اب یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کون سی سمجھ قابل قبول ہے

اس تمام این و آں کے بعد پروفیسر صاحب ایک دوسرا رنگ اختیار کرتے ہوئے فرماتے ہیں

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس بنا پر لکھا ہے کہ نامہ زیر بحث واقعی ایک عہد نامہ ہے۔ . . . . اور یہ طریقہ ہم نے محض اتمام حجت کے لیے اختیار کیا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ نامہ زیر بحث سرے سے عہد نامہ ہی نہیں بلکہ ایک دستور العمل ہے جو بارگاہ ریاست سے صادر ہوا جسے حضرت نے تمام مدینہ والوں مہاجر، انصار، یہود و مشرکین کے لیے لکھوایا (ایسے مکتوب کو آج کی اصطلاح میں اعلان سلطانی یا رائل کمیونک، رائل پروکلیمیشن کہا جا سکتا ہے۔

بہت خوب! ایک غلط دعوے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے "اتمام حجت" اور "اظہارِ حقیقت" کے نام سے جس قدر شقوق کسی تحریر کے متعلق پیدا کیے جا سکتے ہیں وہ سب ہی بیان ہو جائیں تو بہتر ہے۔ مگر اس "معاہدہ" کو دستور العمل بتا کر اعلان شاہی، یا رائل کمیونک کہنا سیرت نبوی کے تمام

واقعات اور سوانح حیات کو درہم و برہم کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ باتفاق علماء سیر و تاریخ ہجرت مدینہ کے بعد بھی ایک عرصہ تک مسلمانوں کے نظام حکومت کی یہ صورت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ غیر مسلموں کے لیے آپ کا کوئی اعلان یا کوئی تحریر "شاہی اعلان یا رائل کمیونک" کہلا سکتا بلکہ باتفاق جمہور صورت حال یہ تھی کہ آپ مخالفوں سے یا صلح و آشتی کے معاہدات کرکے امن و اطمینان کے خواہشمند تھے اور یا نبرد آزما اور ناقضین عہد کے مقابلہ میں جنگ کرکے اُنکی فتنہ سامانیوں کے کچلنے میں مصروف اور خود جناب کو بھی اس کا اعتراف ہے اگرچہ اتمام حجت کے بعد اظہار حقیقت کے وقت شاید آپ نے اس کو فراموش فرما دیا اکتوبر کے برہان صہ ۲۰۹ پر آپ نے تحریر فرمایا ہے۔

> یہ اور اسی قسم کی ہدایتیں اور شروط مصلحت کے قالب میں ڈھلی ہوئی رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) غیر مذہب والوں کے سامنے جبکہ اُن کو اپنے ساتھ ملانا بھی چاہتے ہیں ایسے وقت میں پیش کرتے ہیں کہ مدینہ میں کوئی اعلیٰ قوت آپ کے ساتھ نہیں ہے ساز و سامان کی الگ کمی ہے اور سامنا قریش جیسے دشمن سے ہے جو شوکت و قوت بھی رکھتا ہے، اور ساز و سامان بھی۔

اس عبارت میں نشان زدہ جملے اتمام حجت کے لیے معروضہ نہیں ہیں بلکہ اُس وقت کی صحیح حالت کا نقشہ ہے۔ اسی طرح اس عبارت سے اوپر کی چند سطور قابل غور ہیں پروفیسر صاحب فرماتے ہیں:۔

> اور یہ وفاق چونکہ دفاعی وفاق ہے کہ اس میں اُن کا بھی فائدہ ہے۔ جنگ کے زمانہ میں ان کا اپنا خرچ آپ اُٹھانا ہوگا جیسے مسلمان اپنا خرچ آپ اُٹھائینگے۔

کیا شاہی اعلان یا رائل کمیونک کا "دستور العمل" ایسی حالت میں سب قوموں کے لیے شائع کیا جاتا ہے جبکہ مخالف جماعتیں نہ اُس بادشاہ اور حاکم کی مستامن و ذمی رعایا ہوں اور نہ رعایا بننا پسند کرتی ہوں، بلکہ برابر کی معاہد اور حلیف ہی رہنا چاہتی ہوں اور جب مدینہ پر چڑھائی کرنے والوں سے جنگ

چھڑ جائے تو وہ آزاد جماعتوں کی طرح مصارف جنگ کے علیحدہ علیحدہ ذمہ دار ہوں،

نیز تاریخ وسیرت کی ایک شہادت بھی اس کی تائید نہیں کرتی کہ قبائل انصار کے یہود، مسلمانوں کے محکوم تھے۔ پس اگر ایک مرتبہ آپ یہود سے متعلق عہدنامہ پر بحث کی شرائط کا پھر مطالعہ فرمائیں تو آپ کو اقرار کرنا پڑے گا کہ یہ نامہ ان کے حق میں ہرگز شاہی اعلان کی حیثیت نہیں رکھتا

اور اگر پروفیسر صاحب کا یہ منشا ہے کہ سرور عالم (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ دستور العمل مسلمانوں کے حق میں تو شاہی اعلان تھا مگر اس میں دوسری جماعتوں کو بیان کردہ دفعات کے تحت دعوت شرکت تھی اور ان کا بھی نظام اسی وقت ساتھ ساتھ بیان کر دیا گیا تھا کہ جو چاہے ان کو منظور کر کے اس کے تحت میں آجائے،، تو اگرچہ[1] یہ حقیقت کے خلاف ہے،، مگر بر سبیل تسلیم یہ اعلان غیر مسلموں کے حق میں اس حالت میں بھی معاہدہ ہی کہلائے گا اور آج بھی دنیا کی حکومتوں میں معاہدہ (پیکٹ) ہی کہلاتا ہے۔ مثلاً برطانیہ نے موجودہ جنگِ یورپ کے متعلق اپنی قلمرو میں اعلان شاہی کے نام سے جرمنی کے خلاف شرکت کے متعلق ایک اعلان کیا اور اس میں ایک طرف اپنی رعایا کو وفاداری اور باہمی اتحاد کے ساتھ حکومت کی حمایت وغیرہ کا ذکر کیا تو دوسری جانب اس میں دوسری آزاد طاقتوں کو اپنے ساتھ شریک کرنے کے متعلق بھی دفعات بیان کیں۔ پس اس اعلان کے مطابق جو بھی آزاد طاقتیں برطانیہ کی ہمنوائی پر آمادہ ہونگی ان کے حق میں یہ اعلان ایک معاہدہ اور پیکٹ کی شکل اختیار کرلے گا، اور کمیشنوں کے ذریعہ کانفرنس کر کے اس کی تکمیل کر دی جائے گی گر خود اپنی رعایا کے حق میں وہ اعلانِ شاہی رہے گا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اس زمانہ میں آج کی طرح طول طویل

[1] صحیح معنی میں شاہی اعلان یا رائل کیونک کا وقت فتح مکہ کے بعد کا ہے فتح مکہ کا خطبہ، حجۃ الوداع کا خطبہ، مشرکین کے حج بیت اللہ پر پابندی کا اعلان، یہود کا سرزمین حجاز سے اخراج کا فیصلہ، سرزمین حجاز میں غیر مسلموں کے قاتح کا اعلان جیسے اعلانات و فرامین بلاشبہ اس تعریف میں آتے ہیں۔ اور یہی صحیح ہے۔

طریقے رائج نہ تھے۔

درحقیقت زیرِبحث معاہدہ میں یہود کی رضامندی کا بیّن ثبوت خود اقباساتِ معاہدہ میں ہی موجود ہے جو تفصیل کے ساتھ بیان ہوچکا۔ پھر بنی قینقاع، بنی نضیر، بنی قریظہ کی مخالفانہ جدوجہد کو اربابِ سیرت ائمہ حدیث، ائمہ تفسیر کا سیرت کی کتابوں، صحیح احادیث کی تشریحات، اور سورۂ حشر کی تفسیر میں متفقہ طور پر نقضِ عہد کہنا اور فقہاءِ امت کا اسی بنیاد پر فقہی مسائل کا مستنبط کرنا بھی ہمارے دعوے کی روشن دلیل ہے۔

لہٰذا اسے براہِ راست "معاہدۂ یہود" کہا جائے یا "اعلانِ شاہی کی شکل دی جا کر معاہدہ" کہا جائے حاصل ایک ہی ہے اور الفاظ کی اُلٹ پلٹ سے نفسِ معاملہ پر مطلق اثر نہیں پڑتا۔

پروفیسر صاحب اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

اس دعوے کی دلیل کیا ہے اب وہ سُنیے :۔

کتاب کا لفظ عربی زبان میں بہت عام ہے اور ابتدارِ اسلام میں عام تر تھا اس لئے لفظ کتاب سے ہر جگہ معاہدہ مراد لے لینا صحیح نہیں، یہی حال صحیفہ کا سمجھئے۔ یہ تعین قرینہ سے ہوتا تھا کہ وہ کتاب (یا صحیفہ) کوئی حکم و فرمان ہے، یا عہدنامہ، وصیت ہے یا وکالت نامہ یا کچھ اور، یہاں نامۂ زیرِبحث میں وہ قرائن موجود ہیں جن کی بنا پر اس کو عہدنامہ نہیں کہا جا سکتا اور نہیں کہنا چاہئے تھا مگر اس بات میں تسامح ہوتا آتا ہے۔ الخ

اور اس کے بعد ابوعبید کی کتاب الاموال سے دو مکتوباتِ نبوی کو پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ اگرچہ مسلمانوں کے نام فرمان ہیں مگر ابوعبید نے مسامحۃً ان کو معاہدات ہی کے باب میں ذکر کیا ہے۔ مگر معلوم اس طوالت سے پروفیسر صاحب کو کیا فائدہ جبکہ ہم نے یہ دعویٰ ہی نہیں کیا کہ جس مقام پر نامۂ نبوی میں کتاب کا لفظ ہوگا وہ ضرور معاہدہ ہوگا۔ اور نہ ہمیں ابوعبید کی مسامحت سے انکار۔ لیکن اس سے یہ کیسے

لازم آیا کہ ابو عبیدہ جس نامۂ نبوی کو بھی معاہدہ کہیں وہ مسامحت ہی کی بنا پر ہوگا اس طرح تو ایک معاہ بھی معاہدہ نہ رہے گا۔ پھر اس قسم کی مسامحت اگر کسی عالم سے ہوتی ہے تو دوسرے علما کی جانب سے اس کی اصل حقیقت بھی واضح ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر نے اپنی تاریخ میں اور دوسرے علمائے سیر نے ان ہر دو مکاتیب کو معاہدات میں شمار نہیں کیا اور فرامین ہی کی طرح بیا کیا ہے مگر معاہدۂ زیر بحث کے معاملہ میں ان کو پیش کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ بارہا ذکر ہو چکا کہ اس کو خلف سے سلف تک سب ہی نے معاہدہ تسلیم کیا ہے اور نہ یہ بلکہ احکام قرآ حدیثی، اور فقہی میں اس کو سند و شہادت بنایا ہے۔ بہرحال اب پروفیسر صاحب کے قرائن قابلِ توجہ ہیں۔ فرماتے ہیں

اب لیجئے وہ قرائن جن کی بنا پر زیر بحث نامۂ نبوی کا عہدنامہ نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اول یہ کہ اس مکتوب گرامی میں باوجود نہایت طول طویل ہونے کے اول سے آخر تک کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جو اس معاہدہ ہونے پر دلالت کرے مثلاً سلم۔ سالمہ، امنۃ ذمۃ، موادعۃ، مصالحہ، عقد، عہد، معاہدہ، میثاق۔ الخ

اس سلسلہ میں میری یہ گذارش ہے کہ اول تو مجھے یہ تسلیم نہیں کہ جب تک الفاظ مسطورہ بالا نہ ہوں گے تحریر معاہدہ نہیں بن سکتی۔ اگر قرائن صاف صاف اس بات پر دلالت کرتے ہوں کہ اس تحریر زاویۂ نگاہ معاہدہ ہے تو بلاشبہ وہ معاہدہ ہے خواہ پروفیسر صاحب کے بیان کردہ الفاظ میں سے ایک لفظ بھی اس میں موجود نہ ہو۔ البتہ یہ الفاظ عموماً معاہدات میں پائے جاتے ہیں اس لئے یہ معاہدات کے لئے یہ بہترین قرینہ ہیں۔ فقہا بھی اکثر یہی قرینہ بیان کرتے ہیں ساتھ ہی اس کو نہیں مانتے۔ دوسرے یہ کہ شاید اس عبارت کے لکھتے وقت پروفیسر صاحب نے معاہدہ کو پڑھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی۔ اگر وہ اس کو پڑھنے کی تکلیف گوارا فرما لیتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اس نامۂ نبوی

ان الفاظ میں سے ایک نہیں بلکہ تین الفاظ سلم، مصالحۃ اور امن، موجود ہیں ملاحظہ ہوں معاہدہ کی دفعات ذیل

وانہ من تبعنا من الیھود فان لہ المعروف[1] الاسوۃ غیر مظلومین ولا متناصر علیھم وان سلم المومنین واحد، ولا یسالم مومن دون مومن فی قتال فی سبیل اللہ الا علی سواء وعدل بینھم	اور بلاشبہ جو یہود ہمارے اسی معاہدہ کے پیرو (پابند) ہیں ہماری طرف سے اُن کے لئے خیرخواہی اور صلاح کاری ہے نہ ان پر کوئی ظلم کرسکیگا اور نہ اُن کے خلاف ہم کسی کی مدد کرینگے۔ اور یہ یقینی ہے کہ تمام مسلمانوں کی صلح (سلم) ایک ہے (یعنی تمام مسلمانوں کے ذمہ ہے کہ اس مصالحت کو اپنی طرف سے باقی رکھیں) اور کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کو چھوڑ کر جہاد فی سبیل اللہ میں ایسی صلح
وانھم اذا دعوا الیھود الی صلح حلیف لھم فانھم یصالحونہ وان دعونا الی مثل ذلک فانہ لھم علی المومنین	اور بالیقین جب مسلمان (اس صلنامہ کی رو سے) یہود کو اپنے کسی حلیف کے ساتھ صلح کرنے کو کہیں تو انکو ایسا کرنا ہوگا۔ اور اگر اسی طرح یہود مسلمانوں کو اپنے حلیف سے صلح کرنے کو کہیں تو مسلمانوں
وان المدینۃ جوفھا حرم لاھل ھذہ الصحیفۃ	اور بلاشبہ مدینہ اس صحیفہ کے پابند جماعتوں کے لئے (حرم) مقام امن ہے۔
وانہ من خرج آمن، ومن قعد آمن (بالمدینۃ)[1] الا من ظلم واثم	اور (اس صحیفہ والے) مدینہ سے باہر جائیں یا مدینہ کے اندر رہیں برابر امن میں ہیں جب تک ظلم یا (عہد کی) نافرمانی نہ کریں۔

[illegible]

[illegible]

[1] یہ جملے کتاب الاموال سے منقول ہیں اور لفظ (بالمدینہ) ابن ہشام اور تاریخ ابن کثیر سے منقول ہے۔

ہم نے "انه من تبعنا من الیهود" سے اس لئے شروع کیا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ معاہدہ کی پہلی دفعہ میں عام الفاظ کے ساتھ معاہدین کے تذکرہ کے بعد اس جگہ سے "الیهود" کہہ کر یہود کو صراحت کے ساتھ اس معاہدہ کا معاہد ظاہر کیا گیا ہے اور آئندہ تمام دفعات میں وہ کسی نہ کسی حیثیت سے شریک ہیں۔

اور اگر اس سے پہلے جملہ کو بھی نقل کر دیا جائے تو ایک چوتھے لفظ "ذمہ" کا بھی اضافہ ہو جائے گا اور صحیح اضافہ ہو جائے گا یعنی

وان ذمة الله واحدة یجیر	اور اللہ کی پناہ ایک ہے ایک ادنیٰ مومن بھی
علیهم ادناهم	سب مسلمانوں کی جانب سے پناہ دے سکتا ہے

میں نے "صحیح اضافہ" اس لئے کہا کہ حقیقت امر یہ ہے کہ چونکہ اسلامی تاریخ میں یہ پہلا معاہدہ تھا اس لئے مسلمانوں کو یہ بتانا ضروری تھا کہ مسلمانوں کی نگاہ میں معاہدہ کی حیثیت کیا ہونی چاہئے اور یہ کہ امن اور عہد دینے میں باہم مسلمانوں کے درمیان امیر اور عام مومن کے درمیان اور خود مسلمانوں کے درمیان امارت و فقر یا کسی دوسرے اعتبار سے کوئی امتیاز ہے یا نہیں۔ اس لئے "ذمہ" اور "سلم" کا جو ذکر مسلمانوں کو مخاطب کر کے کیا گیا ہے اس کے مصداق معاہدین معاہدہ زیر بحث تو سب سے پہلے ہیں اور آئندہ کے لئے معاہدہ کی یہ دفعات مسلمانوں کے لئے "اسوہ" کے طور پر بھی ہیں۔ نہ یہ کہ بغیر کسی خارجی مصداق کے یہ صرف ایک عام قانون اور دستور ہے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب ایک طویل عبارت میں دوسرا قرینہ بیان فرماتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس معاہدہ میں لفظ "بین" آیا ہے اور اس کا طریق استعمال یہ ہے کہ کبھی دو متمایز چیزوں کے درمیان مکرر آتا ہے فان کان من قوم بینکم وبینهم میثاق اور کبھی ایک بار جیسے بین المرء وزوجه اور جب ایک بار آتا ہے تو ہمیشہ پہلی فرد پر داخل ہوتا ہے جیسے ان الله

یحول بین الم، وقلبہ اس کے خلاف نہیں آتا اور معاہدہ میں کم از کم دو فریق ہوتے ہیں۔ اس سے آگے چل کر ارشاد ہوتا ہے۔

اس لئے یہاں تین اہم تقدیری صورتیں سزا مر کی ہو سکتی ہیں۔ ھذا کتاب من محمد النبی بین المومنین من قریش ویثرب وبین المسلمین من قریش ویثرب ومن تبعھم دوسری یہ کہ بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب وبین من تبعھم تیسری یہ کہ بین المومنین وبین المسلمین وبین من تبعھم ان تینوں صورتوں میں سے کسی صورت میں بھی یہ مکتوب رسول اللہ کا معاہدہ نہیں کہلا سکتا بلکہ ان صورتوں میں آپ صرف ایک ثالث یا سرپنچ رہ جاتے ہیں اور یہ مکتوب معاہدہ کی بجائے حکمنامہ بن جاتا ہے الخ

پروفیسر صاحب نے اس مضمون کو زورِ عربیت میں بڑے کرّوفر سے بیان کیا ہے لیکن ایک حقیقت بین نگاہ پر یہ آشکارا ہے کہ وہ اس سے جو مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ اس کلام کی تقدیر عربیت کے قاعدہ سے یہی ہے بین المومنین والمسلمین من قریش واھل یثرب وبین من تبعھم فلحق بھم نحل معھم وجاھد معھم، اور یہ اس تقدیر پر بلا شبہ معاہدہ ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کے لئے سب سے پہلے اس حقیقت کو سمجھ لینا ضروری ہے کہ مدینہ کے اس ابتدائی دور میں (جو اس معاہدہ کا دور ہے) مسلمانوں اور غیر مسلموں کی حیثیت کیا تھی؟ اس پر گذشتہ صفحات میں کافی لکھا جا چکا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ جس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں تشریف فرما ہوئے اس ابتدائی زمانہ میں مدینہ کی حیثیت "دار الامان" کی تھی نہ کہ "دار الاسلام" کی مسلمانوں کا حکمران ہونا اور غیر مسلموں کا ان کی ذمی رعایا ہونا یہ کیفیت ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی اسی لئے فقہاء اسلام نے قرآن عزیز و احادیث نبوی سے دار الاسلام کے جو احکام بیان کئے ہیں وہ یہاں پر عائد نہ تھے اور اسلئے

فقہا کی نگاہ میں اس وقت تک مدینہ دارالاسلام نہ تھا دارالامان تھا۔

چنانچہ بحرالعلوم علامہ محمد انور شاہ صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند وڈابھیل نور اللہ مرقدہ نے بھی جو کہ اعلم بالعربیہ تھے اس معاہدہ کو معاہدہ تسلیم کرتے ہوئے اس کو دارالامان کے احکام میں شامل فرمایا ہے۔

اصل صورت حال یہ تھی کہ اوس وخزرج کی وہ سرداری جو عبداللہ بن ابی سے ملنے والی تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب خود بخود اس طرح منتقل ہوگئی کہ ان ہردو قبائل کی بہت بڑی تعداد (باستثنا افراد) مسلمان ہوکر حلقہ بگوش اسلام ہوچکی تھی۔ مگر یہود مدینہ اپنی آمدِ یثرب کے وقت ہی سے اُن کے حلیف بن کر یہاں بس گئے تھے اور آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ ہجرت نبوی سے پہلے اوس وخزرج کے محکوم تھے اور نہ ہجرت کے بعد اُن پر مسلمانوں کی حکمرانی تھی۔ تو اب جبکہ مدینہ میں سیاسی اور ملکی اقتدار کے اعتبار سے کسی کی حکمرانی نہ تھی بلکہ مختلف جماعتیں تھیں، مسلمان، منافقین اور یہود اور مدینہ سے باہر مکہ اور اطراف میں قریش مشرکین اور اُن کے حلفاء آباد تھے۔ تو ان حالات کے پیش نظر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے (بحکم وحی الہی) ان جماعتوں کو تین حصوں پر تقسیم کر دیا۔ ایک محارب (نبرد آزما دشمن) یہ مشرکین مکہ تھے۔ دوسری قابل نظر انداز جماعت یعنی نہ اُن سے صلح نہ جنگ یہ منافقین تھے۔ تیسری جن سے صلح و معاہدہ مفید تھا یہ یہودِ بنی قینقاع، قریظہ اور نضیر وغیرہ تھے۔ اور جبکہ یہ معاہدہ اور صلح ایسے زمانہ میں ہو رہی تھی کہ اوس وخزرج کی باہمی عداوت کے خاتمہ کا وقت بہت قریب کا زمانہ تھا۔

نیز جن جماعتوں کو انھوں نے حلیف بنایا ہوا تھا وہ جاہلیت کے طریقہ اور دستور کے مطابق تھا۔ اس لئے ضرورت تھی کہ پہلا اسلامی معاہدہ ان مذکورہ بالا مصالح کو پیش نظر رکھ کر کیا جائے پس مِن محمد رسول اللہ سے اس لئے ابتدا کی گئی تاکہ یہ بتایا جائے کہ یہ معاہدہ

اگرچہ مومنین اہلِ یثرب و قریش اور یہود کے درمیان ہو رہا ہے مگر اوس و خزرج اہلِ یثرب ہونے کے ساتھ ساتھ "مسلمان" ہیں اور اب ان کے معاملات کی حقیقی قیادت اُس ہستی کے ہاتھ میں ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا جاتا ہے اس لئے یہ معاہدہ دراصل آپ کا معاہدہ ہے یہ مقصد نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان جماعتوں کے سرپنچ ہیں۔

اور اس کے بعد معاہدہ میں ایسی دفعات بھی شامل کی گئیں جن سے خود مسلمانوں پر بھی یہ واضح ہو جائے کہ جب کسی غیر مسلم کے ساتھ معاہدہ کیا جائے تو امن صلح، پابندی عہد، نقض عہد، صلح و مواساۃ کے معاملات کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔ اور انصار کے قبائل کے باہم اور قریش مہاجرین کے درمیان دیت، زرِ فدیہ کے احکام بھی آجائیں تاکہ باہمی فتنہ و فساد کی بھی جڑ کٹ جائے اور یہود کو بھی ان معاملات سے عبرت و بصیرت کا موقعہ ملے اور جس اہم مقصد کے لئے یہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ مستحکم اور مضبوط ہو جائے اور اس طرح یہ معاہدہ ایک آئندہ معاہدات کے لئے "اسوہ" بن جائے۔ چنانچہ بعد میں ہونے والے معاہدوں کے لئے صلح و نقض صلح میں وقتی دفعات کے علاوہ اس کی بہت سی دفعات بلاشبہ "اسوہ" ثابت ہوئیں۔

اس کے برعکس جن عہدناموں میں فلاں یا الیٰ فلاں آیا ہے یا جن میں بین رسول اللہ و بین فلاں ہونا چاہئے وہ تمام ایسے عہدنامے ہیں جو مصالحین میں اُن حکام اور سرداروں سے ہوئے ہیں جو خود مختار اور حاکم کی حیثیت سے اپنی قوم اور دوسرے باشندوں کو رعایا بنائے ہوئے تھے یا اُن شہروالوں اور قوموں سے جو مسلمانوں سے الگ خطہ میں آباد اور اپنی چھوٹی یا بڑی خود مختار ریاست رکھتے تھے۔ اُن کا حال مدینہ کیطرح ہرگز نہ تھا کہ ایک ہی آبادی میں مسلم و غیر مسلم جماعتیں آباد ہوں اور اس وقت تک وہاں خود مستقل حکومت کسی کی بھی نہ ہو۔

پس جو شخص ان تاریخی فروق سے غفلت برتتا ہے یا ناآشنا ہے وہی اس قسم کے

انتشار خیالات میں سرگرداں رہ سکتا ہے اور یا پھر ایک غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کی ناکام سعی میں مشغول، جیسا کہ پروفیسر صاحب کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے۔

حافظ ابن قیم بھی زاد المعاد میں ان تینوں جماعتوں سے متعلق بصراحت اس طرح ارشاد فرماتے ہیں۔

فعامل کل طائفۃ من ھذہ الطوائف	پس مذکورہ بالا جماعتوں میں سے ہر ایک جماعت
بما امرہ بہ ربہ تبارک وتعالیٰ	کے ساتھ آپ نے وہی معاملہ کیا جس کا حکم آپکو
فصالح الیھود وکتب بینھم وبینہ	اللہ تبارک وتعالیٰ کی درگاہ سے ملا پس اسی
کتاب امن وکانوا ثلاث طوائف	بنا پر آپ نے یہود سے صلح کی اور اپنے اُنکے
حول المدینۃ بنی قینقاع وبنی النضیر	درمیان عہد نامہ امن لکھا اور یہ اطراف مدینہ
وبنی قریظۃ الخ	میں تین گروہ تھے بنی قینقاع، بنی نضیر،
(جلد ۲ صفحہ ۹۹)	بنی قریظہ۔

اور اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ "عہد نامہ"، حکمنامہ اور شاہی اعلان (دستور العمل) تھا تب بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ اعلان یہود مدینہ پر حاوی تھا یا نہیں، یعنی کیا انھوں نے اس دستور العمل کے نیچے آنے سے انکار کر دیا تھا جیسا کہ آپ کے مضامین سے نتیجہ برآمد ہوتا ہے تب تو ان کو محاربین میں شمار ہونا چاہیے تھا۔ ان کو "عہد توڑنے والے" کہنا کیا معنی؟ خصوصاً بنی قینقاع جو کہ راس المنافقین عبداللہ بن ابی کے حلیف تھے۔ اور منافقین بصراحت محدثین و ارباب سیر نہ حلفاء میں شامل تھے نہ مخالف محاربین میں اور مصلحت الٰہی نے اُن کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا تھا، سو نقض عہد کہنا اس حالت میں قطعاً غلط اور باطل ہوگا۔ ان کے حلیف ہونے کے متعلق حافظ ابن قیم اس طرح تقریر فرماتے ہیں۔

وكانوا حلفاء عبد الله بن ابی بن سلول رئيس المنافقين (جلد ۲ صفحہ ۹۹)

اور بنی قینقاع (آپ کی آمد سے پہلے) عبد اللہ بن ابی بن سلول (راس المنافقین) کے حلیف تھے۔

اور اگر انھوں نے اس کو تسلیم کر لیا تھا اور اُس کی رو سے وہ حلیف اور معاہد بن گئے تھے اور اُس نامۂ مبارک کے مطابق ان پر معاہدین کے تمام احکام عائد ہو گئے تو بلا شبہ یہ نامۂ نبوی "معاہدہ یہود با مسلمانان" کہلانے کا مستحق ہے۔ کیونکہ چند افراد و آحاد کے علاوہ اور منافقین کے علاوہ صرف "یہود" ہی مدینہ اور حوالِ مدینہ میں ایک ایسی زبردست طاقت تھے جن پر مسلمانوں کو ابھی تک حاکمانہ شاہی اقتدار حاصل نہ تھا۔ لہٰذا ایسی صورت میں لفظی گورکھ دھندے واقعیت نہیں بدل سکتے اور "اعلانِ شاہی" اور "معاہدہ" کے اختلافِ تعبیر سے اصل حقیقت پر پردہ نہیں پڑ سکتا۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب فرماتے ہیں۔

یہ ہیں وہ باتیں جن کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ زیرِ بحث نامۂ نامی نہ عہد نامہ نبوی یا یہود ہی نہ کوئی معاہدہ بلکہ بارگاہ نبوت کا ایک اعلانِ عام ہے اور ایک دستور العمل پیش کرنا ہی اسی لئے اس میں مومنوں، مسلموں، یہودیوں، مشرکوں کے ذکر کی اُن کے حقوق و واجبات کی گنجائش ہے بلکہ تبلیغ و ہدایت، تعلیم و تذکیر وعدہ و وعید، انذار و تہدید کی تھی چنانچہ یہ سب باتیں نامہ مبارک میں موجود ہیں۔

گویا اس کے یہ معنی ہوئے کہ جس نامۂ نبوی میں یہ باتیں بھی شامل ہوں وہ معاہدہ نہیں کہا جا سکتا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ پروفیسر صاحب تاریخ اسلام کے یا تو پورے لٹریچر ہی کو بھول دینا چاہتے ہیں یا سہو و نسیان کی جانب طبیعت مائل ہے ورنہ تو قیاسِ باطل کے ساتھ مسطورہ بالا دعویٰ نہ فرماتے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران (نصاریٰ) کے لئے جو صلحنامہ لکھا ہے اُس میں حسب ذیل دفعات قابل ملاحظہ ہیں۔

فمن اکل الربا من ذی قبل فذمتی منها بریئة (کتاب الاموال صفحہ ۸۸)	پس جس شخص نے اہل معاملہ سے سود کھایا تو میرا ذمہ (عہد) اُس سے بری ہے
وعلیهم الجهد والنصح فیما استقبلوا غیر مظلومین ولا معنوف علیهم	اور اُن پر یہ ضروری ہے کہ آپس کے معاملات میں ایک دوسرے کیلئے خیر خواہی اور جانکاہی کا ثبوت دیں اور نہ وہ مظلوم بنائے جائیں گے اور نہ اُن پر تشدد کیا جائے گا۔

اسی طرح اہل ملطیس (نصاریٰ) کے لئے جو عہدنامہ حبیب بن مسلمہ صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لکھا ہے اس کی دفعات قابل مطالعہ ہیں۔

فان تبتم واقمتم الصلوٰة وآتیتم الزکوٰة فاخواننا فی الدین	پس اگر تم (اپنے دین) سے تائب ہو جاؤ اور نماز پڑھنے لگو، اور زکوٰۃ دینے لگو تو تم ہمارے دینی بھائی ہو جاؤ گے۔
ومن تولی عن الایمان والاسلام والجزیه فعدو لله ورسوله والذین آمنوا والله المستعان علیه	اور جو شخص نہ ایمان لایا اور نہ اسلام قبول کیا اور نہ جزیہ دینا منظور کیا پس وہ اللہ، اُس کے رسول، اور مومنوں کا دشمن ہے، اور اس معاہدہ پر اللہ کی مدد کی خواستگاری ہے۔

غور فرمائیے کہ یہ ہر دو معاہدے اپنے انداز تحریر کے لحاظ سے بھی اور حقیقت کے اعتبار سے بھی بالاتفاق بلاشبہ معاہدے ہیں اور مسلّم معاہدے ہیں لیکن ان میں انذار و تہدید، تذکیر و تبلیغ

کس قدر صاف اور واضح الفاظ میں موجود ہے۔ لہٰذا اب یا تو نکتہ آفرینیاں پیدا کر کے ان کے معاہدے سے بھی انکار کر دیا جائے تاکہ "تا ثریا میرسد دیوار کج" کی تکمیل ہو جائے۔ اور یا پھر زیر بحث معاہدہ یہود کو بھی معاہدہ تسلیم کیا جائے۔

اس کے بعد پروفیسر صاحب ایک طویل عبارت میں میرے اس مضمون کی تردید فرماتے ہیں کہ میں نے انصاری کے ایک جملہ کے متعلق "جو انھوں نے غزوہ احد کے زمانہ میں کہا تھا (الا نستعین بحلفائنا من الیھود)[۵] پروفیسر صاحب پر یہ اعتراض کیوں کیا کہ انھوں نے اس کی تشریح میں بنی نضیر و بنی قریظہ کی تخصیص فرمائی اور میری تردید کے ثبوت میں فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ تینوں قبائل اوس خزرج کے حلیف تھے اس لئے میں نے تخصیص نہیں کی بلکہ اس کے مدلول کے اعتبار سے انصاری نے کی" انھوں نے اس کے لئے ایک بڑی طویل بحث فرمائی ہے مگر حاصل بہت تھوڑا ہے مزید برآں یہ کہ میرا اعتراض اپنی جگہ پر پھر بھی قائم ہے اس لئے کہ میرے اعتراض کا تو حاصل یہ ہے کہ آپ کے مسلک کے مطابق انصاری کے اس قول کا مصداق بنی نضیر اور بنی قریظہ نہیں ہونے چاہئیں۔ نیز یہ کہ اگر وہ اس معاہدہ میں شامل نہیں تھے تو کسی طرح مسلمانوں کے حلیف نہیں رہے تھے۔ کیونکہ یہ تینوں قبائل عبداللہ بن ابی بن سلول راس المنافقین کے حلیف تھے اور منافقین بحکم الٰہی نہ مسلمانوں کے حلفاء میں شمار تھے نہ فریق محارب میں بلکہ ان کی مرضی اور حالت پر چھوڑ دیا گیا تھا وہ مدد کا نام بھی لیتے، خود کو مسلمانوں میں شمار بھی کراتے، اور پھر دشمنوں سے ساز باز بھی رکھتے اور میدان جنگ سے بھاگ بھی آتے اور ان کو کوئی سزا بھی نہ دی جاتی، لہٰذا ان کے حلیف بھی مسلمانوں کے حلیف نہ تھے تو پھر انصاری کیسے ان کے متعلق یہ کہہ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں امام بخاری اور حافظ ابن حجر کی تخصیص کے مطابق بنی نضیر بھی غزوہ احد سے پہلے ہی جلا وطن کر دیئے گئے تھے۔ تو ایسی

[۵] یارسول اللہ ہم اپنے یہود حلیفوں کو مدد کے لئے کیوں نہ بلا لیں۔

صورت میں اس جملہ کا مصداق یہ کیسے ہو سکتے تھے۔ اس لئے میں نے عرض کیا تھا کہ پروفیسر صاحب نے ان تینوں قبائل سے مدد نہ لینے کی جو وجہ بیان فرمائی ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ وہی وجہ صحیح ہے جو میری جانب سے پیش کی گئی اور جو جمہور کے نزدیک بھی صحیح ہے وہ یہ کہ ان قبائل نے معاہدہ کے متصل غزوہ بدر ہی کے زمانہ سے نقضِ عہد کے ڈھنگ شروع کر دیے تھے اس لئے ان پر بڑ کے بعد اعتماد کرنے کا موقعہ ہی نہ تھا البتہ طرح طرح کا فی دی گئی اور جب ان کا فتنہ حد سے بڑھنے لگا تو باری باری وہ کیفر کردار کو پہنچا دیے گئے۔

حافظ ابن قیم زاد المعاد میں بنی قینقاع کے متعلق فرماتے ہیں۔

وشر قوا بوقعة بدر واظهروا البغی والحسد — اور وہ بدر کے واقعہ سے پھٹ پڑے اور سرکشی اور حسد کو علی الاعلان ظاہر کرنا شروع کر دیا

پروفیسر صاحب نے یہ شکوہ بھی فرمایا ہے کہ انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ان قبائل سے مسلمانوں نے کبھی مدد نہیں لی اور بدر کے بعد ہی نہیں بدر کے قبل بھی نہیں لی مگر میں نے لفظ "کبھی" کو چھوڑ کر ان کے جملہ کو مخصّص المقام (یعنی احد کے موقعہ پر مدد نہ لینا) بنا دیا۔ اور پھر میرے اس اعتراض کے جواب میں "کہ آپ یہ فرمائیں کہ قبائل انصار کے یہود سے کیوں مدد نہیں لی۔ تحریر فرماتے ہیں۔

اگرچہ احد سے اوس وخزرج کے یہودی از خود یا عبداللہ کے سکھانے پڑھانے سے بھاگ آئے تھے تاہم یہود اپنے مذہب یہودیت پر رہ کر بھی کم وبیش غزوات نبوی میں شریک ہوئے ہیں چنانچہ ابوعبید بن سلام نے کتاب الاموال میں لکھا ہے اور روایت کو زہری تک پہنچایا ہے کان الیھود یغزون مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیسھم لھم۔ یہ یہود اوس وخزرج ہی کے یہود ہو سکتے ہیں۔

مجھے پروفیسر صاحب کی "کبھی" کے حصر کا انکار نہیں ہے۔ بےشک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

تو کسی غزوہ میں ان تینوں قبائل سے مدد لینے کی نوبت نہیں آئی۔ بدر کے بعد مدد نہ لینے کی وجہ لکھ چکا ہوں کہ بدر کی کامیابی ہی سے انھوں نے گڑبڑ شروع کردی تھی اور بدر سے پہلے کوئی غزوہ ایسا نہیں ہوا جس میں ان کی مدد کی ضرورت ہوتی بلکہ چھوٹے غزوات میں تو تمام مسلمانوں کی شرکت بھی ضروری نہیں سمجھی گئی جیسا کہ کتب سیرت سے واضح ہے۔ امام شافعی تحریر فرماتے ہیں۔

فوادعت یھود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم تخرج الی شیئ من عداوتہ بقول یظھر ولا فعل حتی کانت وقعۃ بدر	پس یہود اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان معاہدہ ہوگیا اور اس وقت سے بدر کے واقعہ تک یہود نے مسلمانوں کے خلاف نہ ظاہر میں کوئی بات کی اور نہ کوئی عمل کیا دا لبتہ

(جلد ۴ ... [redacted] ... بدر کے بعد مخالفت ظاہر ہوگئی)

لیکن آپ کا زہری کی روایت سے استدلال کرنا "کہ اوس وخزرج کے یہود بھی آپ کے ساتھ غزوات میں شریک ہوتے اور حصہ پاتے تھے" صحیح نہیں ہے اوس وخزرج کے یہود کا شریک جہاد ہونا تو ابھی تک کسی روایت سے بھی ثابت نہیں ہوا۔ البتہ صرف ایک مرتبہ "بنی قینقاع کے چند یہود سے" ضرور آپ نے غزوات خیبر میں مدد لی تھی جو انفرادی طور پر آپ کے ساتھ شریک ہوئے اور حصہ پایا اور لفظ کان یغزون۔ جہاد میں جاتے تھے "یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ ایسا ہوتا رہتا تھا کیونکہ بعض مرتبہ صرف ایک واقعہ کو بھی اس انداز سے بیان کردیا جاتا ہے۔ دیکھئے حضرت عائشہ صدیقہؓ نے حج کے موقع پر صرف ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قربانی کے جانوروں (ہدی) کے قلادہ کی رسیاں بٹی تھیں مگر وہ اس کو اس انداز سے فرماتی ہیں۔

کنت افتل ھدی قلائد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ترمذی)	میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدی کے قلادے بٹا کرتی تھی۔

چنانچہ اس مقام پر بھی ذخیرۂ روایات میں جستجو اور تلاش کے بعد صرف ایک ہی واقعہ یہود کی مدد کا ملتا ہے۔

امام شافعیؒ غیر مسلموں سے غزوات میں مدد لینے کے جواز کی بحث میں تحریر فرماتے ہیں۔

ثم استعان رسول اللہ صلی اللہ	پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دو سال
علیہ وسلم بعد بدر بسنتین فی	بعد خیبر کے غزوات میں بنی قینقاع کے چند
غزاۃ خیبر بعد دمن یہود بنی	یہودیوں سے مدد لی (کیونکہ) وہ اپنی جماعت میں
قینقاع کانوا اشداء	بہت بہادر اور شجاع تھے۔

اب غور فرمائیے کہ پروفیسر صاحب کی تحقیق کی ساری داستان کا کس آسانی سے فیصلہ ہوگیا اور میری گذارش اُسی طرح اپنی جگہ مستقیم رہی۔

آگے چل کر پروفیسر صاحب نے اس پر بحث فرمائی ہے کہ "انصار" کا اطلاق کن قبائل پر ہوسکتا ہے سو اس کے متعلق میرا اعتراض تو صرف یہ تھا اور ہے کہ جن قبائل کو بھی "انصار" کا لقب دیا گیا ہے وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے دیا گیا ہے۔ اگر اوس وخزرج کے کسی قبیلہ کا کوئی خاندان (بطن) اسلام سے (معاذ باللہ) بے بہرہ رہا تو اُس کو "انصاری" نہیں کہہ سکتے۔ اسی لئے قبائل انصار کے یہود پر "انصار" کا اطلاق صحیح نہیں ہے البتہ "یہود قبائل الانصار" صحیح ہے اور سہیلی سے جو عبارت پروفیسر صاحب نے نقل کی ہے۔

ولم یکن الانصار اسمائھم فی الجاھلیۃ	اور ان کا نام جاہلیت میں "انصار" نہیں تھا تا
حتی سماھم اللہ بہ فی الاسلام وھم	آنکہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے دور میں اُن کا "انصار"
بنو الاوس والخزرج	نام رکھا اور یہ بنو اوس وخزرج ہیں۔

اُس کا مطلب بھی یہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ مثلاً عبداللہ بن ابی اور اس کی منافق

جماعت کے اکثر افراد اوس و خزرج کے قبائل ہی میں سے تھے مگر محض اوسی و خزرجی ہونے کی وجہ سے ان کو "انصار" نہیں کہہ سکتے۔ اور یثرب کے مسلمانوں سے میری مراد اوس و خزرج کے مسلمان قبائل سے تھی کیونکہ اس موقع پر جانبین کے تخاطب میں "اسرائیلی" مفروغ عنہ ہیں۔

میں نے حضرت مولانا حسین احمد صاحب پر پروفیسر صاحب کی نکتہ چینیوں کا جواب دیتے ہوئے ان کی لفظی گرفت پر یہ عرض کیا تھا کہ یہ طریقہ حق پسند اہل قلم کے نزدیک "نارو" اور "نامناسب" ہے مگر پروفیسر صاحب ابھی تک برابر اس میں الجھے ہوئے ہیں اور قبائل انصار کا یہود کے سلسلہ میں ان قبائل کو مسلمانوں کے قبائل کے ساتھ ساتھ یہود کے قبائل بھی کہہ دینے پر بحث کے لئے تیار ہیں مگر مجھے نفس مسئلہ کی تحقیق کے علاوہ لفظی بحثوں سے دلچسپی نہیں اس لئے کہ اس قسم کی لغزشیں بڑے بڑے عقلاء زمانہ اور اکابر علماء سے ہوتی رہتی ہیں اور بربنار بشریت ہوتی رہیں گی یہ اُس وقت تک ہرگز قابل گرفت نہیں ہوتیں جب تک نفس مسئلہ پر مخالفانہ اثرانداز نہ ہوں اور بیان یہ تعبیر مسئلہ کی اصل حقیقت کو کسی طرح نہیں بدلتی۔

اس علمی بحث کے تمام گوشوں کی تحلیل کے بعد اب صرف ایک بات باقی رہ جاتی ہو جس کا صاف ہو جانا بھی ضروری ہے وہ یہ کہ اگر یہ صحیح ہے کہ مدینہ میں ابھی اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی تو زیر بحث معاہدہ میں ایسے الفاظ کیوں ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر مدینہ سے نہ نکل کر جائے اور اگر اس صحیفہ کے معاہدین میں فساد کا اندیشہ ہو تو معاملہ آپ ہی کی جانب رجوع ہوگا۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مدینہ کے اس ابتدائی زمانہ میں اسلامی حکومت کا نہ ہونا تو ایک بدیہی تاریخی معاملہ ہے مگر یہ بھی مسلم ہے کہ مدینہ کی بہت بڑی اکثریت مسلمان تھی اور یہود اقلیت میں تھے اور اگرچہ مسلمان مختلف دشمنوں "مشرکین، یہود، منافقین، اور نصارٰی" میں گھرے ہوئے تھے اور اس کی وجہ سے یہود جیسی سرکش قوم سے معاہدہ کرنا اسلامی مفاد کے لئے ضروری تھا

تاہم وہ یہود کے مقابلہ میں طاقتور تھے اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی مفاد کے پیش نظر اس سے فائدہ اٹھایا مگر اس کے باوجود طاقتور جماعت "بادشاہ" اور کم طاقت جماعت "رعایا" کی حیثیت میں نہیں ہوتے تھے۔ اور یہ حقیقت تاریخ عرب پر عبور رکھنے والی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے[۵] لہٰذا عہدنامہ میں اس قسم کی دفعات اس زمانہ کی حالت کا صحیح نقشہ ہیں جو سطحی نگاہوں میں البتہ قابل حیرت واستعجاب ہے"

میں نے آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگر پروفیسر صاحب ہی کی بات کو مان لیجئے تب بھی مسئلہ کی صورت یہ ہوئی کہ اس معاہدہ کی رو سے مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان "اُمتہ واحدہ" متحدہ قومیت قائم کی گئی تھی اور یہی آپ کے دعویٰ کے خلاف حضرت مولانا مدظلہ کا موقعہ استشہاد ہے۔ اس پر پروفیسر صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

"میں کہتا ہوں یہ معاملہ فہم عبارت کا نہیں رائے کا ہے اور پھر رائے بھی ایسی رائے جو قائم ہوسکتی ہے حالات ومقدمات سے جو لوگ کہتے کہ ایک جماعت کے کثیر مسلمانوں اور قلیل غیر مسلموں کا اتحاد ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک جماعت کے کم مسلمانوں اور دوسری جماعت کے زیادہ غیر مسلموں کا اتحاد اور پھر مسلمانوں کے حق میں دونوں کو یکساں خیال کرتے وہ قیاس مع الفارق کو کام میں لاتے ہیں اور اسی لئے غلط نتیجہ پر پہنچتے ہیں"

اگر قارئین کرام کے ذہن سے پروفیسر صاحب کا مضمون "متحدہ قومیت اور اسلام" مطبوعہ برہان اکتوبر ۱۹۳۹ء ابھی تک فراموش نہیں ہوا ہے تو وہ اس عبارت کی داد دے سکتے ہیں کہ انھوں نے

---

[۵] اوس وخزرج کے اسلام لانے سے قبل یہود پر ان کو اسی قسم کی طاقت حاصل تھی حالانکہ یہود کسی وقت میں بھی ان کی رعایا یا ماتحت شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ حلیف سمجھے جاتے تھے اور حریف بھی بن جاتے تھے۔ اوس و خزرج کے مقابلہ میں جنگ کے نتیجہ میں کامیاب ہونے کی تمناؤں کا ذکر بنی اسرائیل کے واقعات میں قرآن عزیز

لس قدر بلیغ پیرایہ میں اصل دعویٰ سے گریز فرمایا ہے گریہ تو اپنے مفروضہ قلعہ کو اپنے ہی ہاتھ سے منہدم کر دینے کے مرادف ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ آپ کی بحث کا محور تو یہ تھا کہ قطع نظر اس سے کہ سیاسی حالات کے اعتبار سے ہندوستان میں متحدہ قومیت مفید ہے یا مضر، فی نفس ”متحدہ قومیت“ مسلم و غیر مسلم کے سیاسی وملکی معاملات میں ”امۃ واحدہ“ ہونے کا ثبوت ہی نہیں ہے اور حضرت مولٰنا حسین احمد صاحب کا ”زیر بحث معاہدہ“ سے اس کے لئے استشہاد بے اصل ہے۔ اس کے لئے طرح طرح کی شقوق پیدا کی گئیں کبھی فرمایا کہ شرعی استشہادات کے لئے یہ روایت ہی غیر معتبر ہے اور کبھی فرمایا کہ یہ معاہدہ ہی نہیں ہے اور کبھی فرمایا کہ اس کو معاہدۂ یہود با مسلمانان کہنا غلط ہے، اور کبھی فرمایا کہ یہ رائل کیونک (املان شاہی) ہے وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ آپ بحث کا آغاز کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

(۱) ”اس رسالہ میں (حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے رسالہ میں) جہاں بہت سی عقلی دلیلیں متحدہ قومیت قائم کرنے کی اور اس کے وجوب وجواز کی پیش کی گئی ہیں وہاں نقلی دلائل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نامہ مبارک بھی ہے جس کو اگر رسالہ کی مذہبی بحث کا محور کہوں تو شاید بیجا نہ ہوگا“ ـــــــــ

(۲) ”اور نامۂ مبارک کو پڑھا۔ اس کے پڑھنے سے جو خیال دل میں آیا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ نے کوئی متحدہ قوم ایسی نہیں بنائی جیسی آپ کی طرف اس رسالہ میں منسوب کی گئی ہے“

اب کہاں تو یہ دعویٰ اور کہاں اُس کے دلائل کا یہ نچوڑ کہ مصالح اسلامی کے لحاظ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو (امۃ واحدہ) متحدہ قومیت مدینہ میں ایک مدت کے لئے بنائی تھی اُس میں مسلمانوں کی اکثریت اور غیر مسلموں کی اقلیت تھی اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب جس قومیت متحدہ کے لئے اس نامۂ نبوی کو پیش فرما رہے ہیں اُس میں غیر مسلموں کی اکثریت اور

اور مسلمانوں کی اقلیت ہے اس لئے یہ قیاس مع الفارق ہے۔

اے کاش اگر پروفیسر صاحب شروع ہی میں اپنے دل کا یہ حال ظاہر فرمادیتے اور شروع مضمون میں یہ ظاہر فرمانے کی کوشش نہ کرتے کہ انہیں وقت کے سیاسی مسئلہ سے کوئی بحث نہیں ہے بلکہ فقط علمی نقطۂ نظر سے یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ زمانۂ نبوی ،،معاہدہ مسلمانان با یہود،، ہرگز نہیں ہے اور اس پر ایک طویل مضامین کا سلسلہ نہ قائم کرتے ۔ تو ہم کو بھی اس دردسری کی ضرورت پیش نہ آتی۔ یہ تو وہی ہوا کہ

کوہ کندن وکاہ برآوردن

ہم کو اس سے تو کبھی انکار نہیں ہے اور نہ ہوسکتا ہے کہ یہ حق ہر ایک صاحب علم کو حاصل ہو کہ وہ اس پر بحث کرے کہ حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی موجودہ زمانہ میں اجنبی طاقت کے مقابلہ میں جس قسم کی داعی متحدہ قومیت کی دعوت دیتے ہیں وہ مفاد اسلامی کے لئے مفید ہے یا مضر؟ اور جیسا کہ میں نے اپنے نومبر کے مضمون کے آغاز میں بتایا تھا کہ اس مسئلہ پر موافقت ومخالفت میں تقریر و تحریر دونوں راہوں سے بہت کافی بحث بھی ہو چکی ہے اور ارباب سیاست اور علماء اسلام نے دونوں حیثیتوں سے اس پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اس لئے اگرچہ بے ضرورت ہوتا مگر پھر بھی آپ کو حق تھا کہ آپ بھی اس پر قلم فرسائی فرماتے اور اس جمہور علماء اسلام کے متفقہ فیصلہ کی مخالفت کی زحمت سے بھی بچ جاتے۔

اس کے بعد یہ تحریر فرماتے ہوئے کہ صحیح مقدمات کے لئے قریش اور اوس وخزرج اور اسرائیلی یہود کی پوری تاریخ معلوم رہنا ضروری ہے۔ پروفیسر صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

"اگر ہمیں یقین ہوگیا کہ یہ سب کچھ پیش نظر ہونے کے باوجود بھی جناب مولوی صاحب کی یہی رائے ہے تو پھر ہم اس تاریخ کو ناظرین کے سامنے پیش کرینگے"

میرے اور میرے ہم خیال علماء اسلام کے سامنے نہ صرف یہ مکمل تاریخ ہے بلکہ قرآن عزیز،

احادیث نبوی ، اور اس سے مستنبط فقہ و اصول کا ذخیرہ بھی پیش نظر ہے اور اس سلسلہ میں بحمد اللہ جو رائے اختیار کی گئی ہے علیٰ وجہ البصیرۃ اختیار کی گئی ہے رہا آپ کا پیش فرمانا سو چشم ما روشن دل ماشاد ،،

نیز پروفیسر صاحب کا یہ ارشاد:-

"غرض یہ ہے کہ پہلے خالص علمی بحث ختم ہو جائے تاکہ پھر علمی سیاسی مسائل آسانی سے طے ہو سکیں"

مجھے اور بھی تعجب میں ڈال رہا ہے کہ یا تو سیاسی مباحث سے بے تعلقی کا وہ اظہار جو شروع مضمون میں نظر آتا ہے اور یا کر ہمت کی یہ چستی جو اس عبارت سے ظاہر ہے - ایں چہ بوالعجبیست؟

اگر پروفیسر صاحب برا نہ مانیں تو یہ گذارش خدمت سامی میں ہو کہ ان علمی سیاسی مسائل نے چند برسوں کی علمی و عملی تحقیق اور جد و جہد کے بعد اب "خالص عمل" کی شکل اختیار کر لی ہے اور اپنے صحیح خیال قائم کر لینے کے بعد بھی تحقیق حق کا اگرچہ ہر وقت دروازہ کھلا ہے تاہم قلمی گھوڑے دوڑانے کا وقت گذر گیا۔ اب "مفاد اسلامی" کے لئے جو کچھ کسی سے ہو سکتا ہے اُس کے "کرنے" کا وقت ہے اختلاف رائے ہمیشہ رہا ہے اور رہے گا۔ اب سیاسی جد و جہد میں "عمل" اور اس کا "نتیجہ" ہی غلط اور صحیح کا فیصلہ کر سکے گا۔ اس لئے کیا اچھا ہو کہ جو راہ عمل آپ کے نزدیک درست ہے اُس پر عمل پیرا ہو کر خدمتِ اسلام انجام دیں۔ عمل سے جو حق ثابت ہو گا۔ اگر دوسرے اہل الرائے کے اندر دیانت ہے تو وہ خود بخود اپنی رائے کی غلطی کا اعتراف کر لیں گے۔

نیز حضرت مولانا کی اس "دعائی متحدہ قومیت" سے آپ کے نقطہ نظر سے بھی شاید اس قدر نقصان نہیں پہنچا، جس قدر اسلام اور اسلامی مفاد کو ان علمی و عملی تحریکات سے پہنچ رہا ہے۔ جو اسلام کے نام پر اس کے حقیقی خدوخال ہی کو فنا کر دینے کے درپے ہیں اور "کافر و مومن" کے فرق کو ایمان باللہ کے خالص اعتقاد سے ہٹا کر دنیا کی دولت و ثروت اور حاکمانہ اقتدار کے وجود و عدم پر قائم کر رہے ہیں اور جو "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم" کی تفسیر میں انگریزی حکومت کو "اولی الامر"

بتاکر اس کی اطاعت کو مذہبی فریضہ اور نص قطعی کی تعمیل ثابت کرتے، اور جہاد کو اسلام کی تعلیم سے یکسر خارج کرتے ہیں اور جو اسلام کو مخصوص اعتقادات اور فرائض کا مذہب نہیں مانتے بلکہ مذہب ہی کے نام سے اُس کو سوسائٹی کی طرح کا مذہب تسلیم کرتے اور اسی طرح ہندو اور عیسائی مشرکوں کی تقلید کو اسوہ ٹھیراتے ہیں۔ اور اس کی دعوت وابلاغ میں تحریر و تقریر کے ذریعہ دن رات کوشاں ہیں۔ اور جو منکر حدیث بنکر اسلامی احکام و عقائد پر براہ راست تیشہ و تبر چلاتے ہیں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ جناب کا ،،علمی قلم،، اُن کے ردعمل میں جولانی دکھائے؟۔

دنیار اسلام کی مسلم آزار طاقت سے رستگاری کے لئے جس قدر وسائل بھی علمار حق نے آج تک اختیار کئے ہیں اور کر رہے ہیں اُن میں تو بہت سے اہل قلم حضرات کو ہمیشہ مسلمانوں کی تباہی نظر آتی، اور مختلف خامیاں، نادانیاں، اور خدا جانے کیا کیا کمزوریاں معلوم ہوتی ہیں لیکن یہ ہمیشہ ہی حیرت زا منظر رہا ہے کہ ان بزرگوں کا ،،اسپ قلم،، اس دلسوزی اور عالمانہ کاوشوں کیساتھ ان میدانوں میں تیزی کیساتھ گامزن ،،نہیں ہوتا جہاں علم و عمل دونوں راہوں سے اسلام کے اصولی اور بنیادی عقائد کو ختم کرکے مذہب کو نئے قالب ،،سوسائٹی کے مذہب،، میں ڈھالا جارہا ہے۔

ان فی ذلک لعبرۃ لاولی الابصار